R. No. 2186/57 — Regd. No. L. 522.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۲۲-۱۲-۶۴

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت تین پیسہ
فی پرچہ

۲۲- دسمبر ۱۹۶۴ء | ایڈیٹر: آل احمد سرور | جلد ۲۳- شمارہ ۴۸

اداریہ

"اُردو مجلس"

آل انڈیا ریڈیو کئی سال سے 'اردو مجلس' کے نام سے آدھ گھنٹے روزانہ اردو کا ایک پروگرام نشر کرتا ہے۔ یہ پروگرام جب شروع ہوا تھا تو اس سے بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں، مگر افسوس یہ ہے کہ پوری نہیں ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پروگرام کو علیحدہ سے اہمیت نہیں دی گئی بلکہ ایک ضمنی چیز سمجھ لیا گیا، ورنہ اس کا الگ انتظام ہوتا اور اسے کشمیر یونٹ کے ساتھ نتھی نہ کیا جاتا۔ کشمیر یونٹ کی اپنی الگ اہمیت ہے اور اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ پروگرام کی افادیت پر پوری توجہ ہو اور اس کی نگرانی کرنے والے کے ذمے دوسرے کسی کام کی نگرانی نہ ہو۔ اسی طرح اردو مجلس کی اپنی الگ اہمیت ہے اور اس کی نگرانی کی ذمہ داری میں بھی کسی دوسرے کام کے نگران کو شریک کرنا اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ ریڈیو کا جو بھی پروگرام ہوتا ہے وہ بہت پہلے سے تیار ہوتا ہے اور سارے وقت کی باقاعدہ عنوان کے تحت تقسیم ہوتی ہے جس کی اشاعت بھی کر دی جاتی ہے۔ اردو مجلس کے آدھ گھنٹے کے پروگرام میں اکثر دو ایک عنوان ملتے ہیں مگر وقت کی تقسیم کا کوئی حساب نہیں دیا جاتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ پروگرام ایک بھرتی کا پروگرام ہے جس میں زیادہ تر پچھلے پروگراموں کے اجزا دوبارہ نشر کیے جاتے ہیں یا ادھر ادھر سے کچھ چیزیں جمع کر کے یکجا کر دی جاتی ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ آدھ گھنٹہ روزانہ کے ایک جامع اور مرتب پروگرام سے بہت فائدہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ یہ پروگرام کو خانہ پری کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ دراصل سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس پروگرام کے مقصد کو سامنے رکھا جائے اور جس طرح ریڈیو کے دوسرے پروگراموں کے ایک ایک منٹ کے کام کی پہلے سے تیاری ہوتی ہے اسی طرح اس کی تیاری کی جائے۔ پھر یہ پروگرام محض مشاعروں کے ریکارڈنگ، پرانے پروگراموں کے ریکارڈنگ اور کچھ غزلوں یا نظموں کے نشر کرنے تک محدود نہ ہونا چاہیے۔ اس میں دس منٹ کی ایک تقریر معلوماتی انداز کی ہونی چاہیے جس میں قومی یک جہتی، جدید ہندوستان کے اہم مسائل، عالمی میلانات، نئی علمی و ادبی تحریکات کو لینا چاہیے۔ اردو کی اچھی کتابوں کا ہر سہ ماہی میں جائزہ لینا چاہیے۔ اردو اخبارات میں جو خاص خاص مسائل آتے ہیں ان پر اظہار خیال ہونا چاہیے۔ داستان گوئی، نظم خوانی، نثر خوانی کے ذریعہ سے اچھی اور معیاری ادبی زبان سے آشنا کرانا چاہیے۔ نظم و نثر کے جدید میلانات پر تبصرہ ہونا چاہیے۔ اردو مجلس کا مقصد اردو پروگراموں کے ذریعہ سے سننے والوں کو قومی معیاروں، عالمی معیاروں اور علمی و ادبی معیاروں سے آشنا کرنا ہے۔ یہ مقصد ابھی پورا نہیں ہوا۔

اس شمارے میں

سیربین

ہمارے ایک دوست ایک یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ایک دن انھیں ایک جلسے میں تقریر کرنا تھی اور تقریر کے بعد کسی دوسرے شہر کو جانا تھا۔ لڑکی سے کہا کہ سامان تیار رکھنا، میں آٹھ بجے تک گھر آجاؤں گا، نو بجے کی گاڑی پکڑنی ہے۔ لڑکی نے پوچھا آپ جلسے میں کس موضوع پر تقریر کریں گے۔ انھوں نے کہا غذائی بحران پر۔ لڑکی نے حیران ہوکر کہا: "کیا تقریریں کرنے سے غذائی بحران ختم ہو جائے گا؟"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں یہ طے ہوگیا ہے کہ ہر مسئلہ تقریروں کے ذریعہ سے حل کر دیا جائے۔ چناں چہ غذائی بحران ہو یا ملک کے بچاؤ کا مسئلہ، قومی یک جہتی کا سوال ہو یا منصوبہ بندی کا، ان پر اتنی تقریریں ہوتی ہیں اور ایسے زور و شور سے ہوتی ہیں کہ لوگوں میں عمل کی طرف میلان باقی ہی نہیں رہتا۔ ساری طاقت تقریریں کرنے اور تقریریں سننے میں ختم ہو جاتی ہے۔ چناں چہ اب بغیر تقریر کے لقمہ نہیں توڑ سکتے کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنا ہو، کسی پل کا افتتاح کرنا ہو کسی شاعر کا جنم دن منانا ہو، کچھ مقرر ضرور ہوں گے۔ اب تو کتاب کی اشاعت کے موقع پر مصنف یا ناشر کے اعزاز میں تقریریں ہونے لگی ہیں۔ تعلیم گاہوں میں استاد صرف تقریر کرتا ہے۔ شاگرد صرف سنتے ہیں۔ استاد کو اس سے غرض نہیں کہ طالب علم سمجھا یا نہیں، طالب علم کو اس سے غرض نہیں کہ علم میں اضافہ ہوا یا نہیں۔ تقریر ہو گئی اور علم کے سارے اسرار و رموز خود بخود روشن ہو گئے۔

آج کل اردو کا سب سے بڑا ہمدرد وہ سمجھا جاتا ہے جو اردو کی حمایت میں ایک زبردست تقریر کر دے یا ایک دردناک مضمون لکھ دے۔ ہاں اسے دو باتوں کا ضرور خیال رکھنا چاہیے اول تو وہ جی بھر کر حکومت یا اکثریت کو کوسے، دوسرے وہ اردو کی کچھ انجمنوں کے عہدہ داروں پر تبرا کرے اور ان کی نااہلی اور بے عملی کا رونا روتے ہوئے تان اس پر توڑے کہ انھوں نے اردو کو حکومت یا اکثریت کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ حکومت کی بے نیازی اور انجمنوں کے عہدہ داروں کی نالائقی مسلّم، لیکن کبھی کبھار تقریریں کر کے اور ایک دو مضمون لکھ کر اور کچھ نیک مشورے دے کر جو لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے اور انھیں نہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانا ہے نہ کسی اردو اسکول کی مدد کرنی ہے، نہ اردو کا کوئی اخبار خریدنا ہے، نہ رسالہ، نہ کتاب، نہ اپنے حلقے میں اردو کے لیے فضا ہموار کرنا ہے، نہ دوسروں کو اردو سے قریب لانا ہے، نہ قومی زندگی میں شرکت کرنا ہے۔ ان کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے۔ ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

انجمن ترقی اردو میسور کا خصوصی اجلاس

انجمن ترقی اردو میسور کا ایک خاص اجلاس مورخہ ۱۲ ماہ رواں کو انجمن اتحاد اسلام میسور کے ہال میں صدر انجمن عالی جناب مولانا رکن الدین صاحب مالک مدیر تنظیم میسور کی صدارت میں منعقد ہوا اور مندرجۂ ذیل تجاویز اتفاق رائے سے منظور ہوئیں۔

• سب سے پہلے جناب عبدالخالق صاحب جنرل مرچنٹ میسور نے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی۔

انجمن ترقی اردو میسور کا یہ خصوصی جلسہ عالی جناب سید عبدالرحمٰن صاحب بی۔ ایس سی، ایم ایل سی نائب صدر انجمن کی والدہ محترمہ کے انتقال پرملال پر دلی رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے سید صاحب ممدوح سے اس سانحۂ رنج دہ پر دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ اس تجویز کے متفقہ رائے سے منظور ہونے کے بعد جناب سید عبدالرحمٰن صاحب نے تجویز پیش کی کہ مجلس انتظامیہ کی مدت ختم ہو چکی ہے لہٰذا اڈھاک کمیٹی بنا کر ممبر سازی کے بعد از سر نو انتخابات رکھے جائیں۔ اس تجویز کی تائید جناب محمد اسحاق صاحب جنرل مرچنٹ نے کی اور یہ تجویز متفقہ طور سے منظور ہوئی۔ اس کے بعد جناب اقبال فریدی نے تجویز پیش کی کہ ۲۷ ماہ رواں کو انجمن کی جانب سے یوم غالب منایا جائے۔ جس پر کافی بحث کے بعد طے پایا کہ شب یک شنبہ ۲۶ ماہ رواں کو یوم غالب کے تحت ایک عام جلسہ اور طرحی مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ مشاعرے کے لیے مندرجۂ ذیل طرح تجویز پائی:-

"ترس رہے ہیں کئی پھول مسکرانے کو"

قافیہ — تملانے۔ لگانے۔ بہانے

ردیف ——— کو

آخر میں حاضرین کے شکریہ پر اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

(اقبال فریدی)

شیخ فرید

تاج محل

اردو ادب اور ہماری زبان کے ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ مضامین... تاج محل... اور... لطف اللہ مہندس... کی چند غلطیوں کی اصلاح فرمالیں۔

اردو ادب (جنوری ۶۴ء) صفحہ ۱۳۰ کی آخری تین سطریں ملاحظہ کیجئے۔

ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی ۵۵...کل اکاو پنج آثار عمل متھرا داس ابن راجی لل اسیر قلعہ توبرتے .... جلوس عالمگیر بادشاہ.......

"کل" دراصل گولہ کا مخفف گلہ ہے۔ قلمی نسخہ میں گاف کا مرکز نہ ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔

"اسیر قلعہ توبرتے"— یوں ہے

"توپ ریزئے قلعہ اسیر"

برہان پور کے نواح میں قلعہ اسیر میں توپ ڈھالنے کا کارخانہ— توپ ریزی— تھا۔ متھرا داس ابن رام جی وہاں "توپ ریز تھے" اور محمد حسین عرب نگران "توپ ریزی"

قلمی نسخہ کے کاتب نے الفاظ کے الٹ پھیر سے عجیب بے معنی ترکیب بنا دی تھی۔

قلعۂ اسیر میں ڈھالی ہوئی ایک توپ "دشمن کوب" قلعۂ گولکنڈہ کی ایک برج پر رکھی ہوئی ہے۔ اس پر کندہ ذیل کے کتبہ نے امور بالا کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔

کتبہ توپ دشمن:—

"درعہد ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی

سنہ ۱۰۸۴ ہجری

توپ دشمن کوب
گلہ سی آثار و باروت دو آثار

توپ ریزی قلعۂ اسیر سنہ جلوس ۱۶
عمل متھرا داس ابن رام جی

(اسلامی کتبات ۴۴-۱۹۴۳ء صفحہ ۲۳)

اردو ادب کے مذکورہ شمارہ کے صفحہ ۱۴۲ پر اور ہماری زبان یکم اکتوبر ۶۴ء کے صفحہ ۱ پر لطف اللہ مہندس کی ذیل کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ صدر صوفی
۲۔ رسالہ خواص اعداد
۳۔ شرح خلاصۃ الحساب
۴۔ تذکرۂ آسمان سخن
۵۔ دیوان مہندس
۶۔ سحر حلال
۷۔ منتخب الحساب

ہمایوں جون ۱۹۳۷ء کے شمارے میں لطف اللہ مہندس کی ایک اور کتاب — جمیع البدائع — کا تعارف کرایا گیا ہے[1]

"جمیع البدائع" وزارت پناہ فضائل دستگاہ شیخ نظام الدین ابن شیخ محمد صالح کی تالیف مجموع الصنائع سے ماخوذ ہے۔ مؤلف کو لطف اللہ نے سلہ اللہ لکھا ہے۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور دو باب پر مشتمل ہے۔

مقدمہ —— تقسیم کلام
باب اول — صنائع لفظی کا بیان
باب دوم — صنائع معنوی کا بیان

اس مختصر رسالہ میں "کہیں کہیں مہندس نے اپنا اور اپنے والد کا کلام نمونہ کے طور پر نقل کیا ہے۔

اس رسالہ میں صنعت تاریخ کے ذیل میں لطف اللہ مہندس نے اپنے ایک ہمجم درس احسن اللہ خاں کی تاریخ وفات لکھی ہے۔

"تاریخ احسن اللہ خاں کہ در مدرسۂ میرزا محمد عادل ہمدرس ایں فقیر بود۔

آخر الامر رفت از عالم
ہر کہ پیدا شد از بنی آدم
احسن اللہ برفت و گفت خرد
احسن اللہ برفت از عالم

(ہمایوں ۱۹۳۷ء صفحہ ۴۱۹)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے مرزا محمد عادل کے مدرسہ میں بھی تعلیم پائی ہے لطف اللہ نے اپنی مثنوی میں اپنے بھائی عطاء اللہ رشیدی سے تحصیل علم اور اکتساب فیض کا ذکر کیا ہے۔

شکر سخن پرور دانش دہم
بندۂ آن حبر سخن پرورم
شکر بودم ز جہاں گوئے علم
از چمنش یافتہ ام بوئے علم

---

[1] جمیع البدائع کے متعلق تمام معلومات اسی مضمون سے ماخوذ ہیں۔

خنک شدم آگہ سرِ نہاں
ازدمِ او یافتہ ام قوتِ جاں
(مضامین سلیمان ص۲۸۵)

جمیع البدایع میں مذکور ہے کہ احمد معمار نے اعظم خاں کے لیے جو پہلے ارادت خاں تھے۔ ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کی ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے۔

چو قانونِ ارادت ساز کردم
باسمِ اعظمش آغاز کردم

اس شعر میں مصرعہ اولیٰ میں ارادت اور مصرعہ ثانی میں اعظم کے اشارے ملاحظہ کیجیے۔

صنعتِ ابداع کی ایک مثال پر یہ رسالہ ختم ہوتا ہے۔

روزِ اول ایاز خواستہ بود
کہ مرا باد عاقبت محمود

"ہماری زبان" ۱۵ر نومبر ۱۹۶۴ء میں صفحہ ۶ پر دو تین جگہ کتابت کی غلطیاں ہیں۔ کالم ۱ سطر ۱۱۔

کہ ہیچ ابر نقش می کند گہر بازی

کالم ۲ سطر ۱۱ شمسۂ ایں عمارت والا

کالم ۲ آخری شعر ع من ست وابا ایاغ است الفت

یوپی میں اگر اردو اسکول کھولے جائیں تو مرکز انھیں مالی امداد دے گا

لکھنؤ ۵ر دسمبر مرکزی وزیر تعلیم شری ایم سی کریم بھائی چھاگلا نے آج یہاں یقین دلایا کہ اگر اتر پردیش میں اردو انگریزی پڑھائی کے لیے اسکول کھولے جائیں گے تو مرکزی وزارت تعلیم ان کو مالی امداد دے گی۔

مرکزی وزیر تعلیم جو یہاں راج بھون میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کر رہے تھے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ انجمن ترقی اردو یوپی کے ایک وفد نے ان سے یہاں ملاقات کی اور شکایت کی کہ اردو پڑھنے والے طلبا کو یہاں اسکولوں میں سہولتیں نہیں دی جا رہی ہیں۔

مرکزی وزیر تعلیم نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ انھوں نے وفد کو یقین دلایا ہے کہ اگر اسکولوں میں اردو کی تعلیم کی سہولتیں نہیں ہیں تو اردو والے اپنے اسکول کھولیں انھیں مرکزی سرکار مالی امداد دے گی۔

ایک نمائندے کے پوچھنے پر کہ کیا یہ صحیح ہے کہ یہاں طلبا اردو پڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں مرکزی وزیر تعلیم نے کہا "مجھے نہیں معلوم"۔

مرکزی وزیر تعلیم شری چھاگلا نے اس استفسار پر کہ کیا اردو کے لیے کوئی خاص مراعات مانگی جا رہی ہیں، کہا کہ "آئین میں جن چودہ زبانوں کو تسلیم کیا گیا ہے ان میں اردو بھی ہے اور اسے بھی ازروئے آئین وہی رعایت دی جانی چاہیے جو بقیہ ۱۳ زبانوں کو دی جانی چاہیے"۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا مرکزی وزارت تعلیم ہندی دشمن پالیسی پر چل رہی ہے، مرکزی وزیر تعلیم نے تیزی کے ساتھ جواب دیا کہ "میں ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا بہت بڑا مؤید اور مبلغ رہا ہوں آپ ملک میں اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت کو سمجھیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی تمام چودہ زبانیں ترقی کریں لیکن کیا مختلف ریاستوں کے درمیان مراسلت کا انگریزی زبان کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ انگریزی بین اقوامی زبان کی حیثیت سے ترقی کرے اور ہندی ہماری سرکاری زبان کی حیثیت سے پھلے پھولے"۔

انھوں نے آگاہی دی کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شمالی ہندستان ہی پورا ہندستان ہے۔

مرکزی وزیر تعلیم نے کہا "اتر پردیش سہ لسانی فارمولے پر عمل نہیں کر رہی ہے اور وہ سنسکرت کو جدید زبان قرار دے کر ہندی اور انگریزی کے ساتھ پڑھا رہی ہے جب کہ دوسری ریاستوں کی اپنی علاقائی زبانیں ہیں اور جنوبی ہندستان کے لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ شمالی ہند کے لوگ سہ لسانی فارمولے پر سنجیدگی سے عمل درآمد نہیں کر رہے ہیں، جنوب میں اسکولوں میں ہندی پڑھائی جا رہی ہے لیکن شمال میں جنوبی ہندستان کی کوئی زبان نہیں پڑھائی جا رہی ہے جو غیر مناسب بات ہے۔" اس استفسار پر کہ کیا اتر پردیش سرکار نے سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد کرنے کا کوئی یقین دلایا ہے۔ مرکزی وزیر تعلیم نے کہا، "صرف اتنا یقین دلایا ہے کہ اس فارمولے پر عمل درآمد کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" (قومی آواز لکھنؤ)

میتھلی شرن گپت کا انتقال

نئی دہلی ۱۳ر دسمبر۔ کل صبح جھانسی کے قریب چرگاؤں میں ہندی کے مشہور شاعر مسٹر میتھلی شرن گپت کا انتقال ہو گیا۔ آپ مہاتما گاندھی جی اور مسٹر نہرو کے قریبی دوست تھے۔ آپ نے ۱۹۲۱ء میں اپنی پہلی کتاب "بھارت بھارتی" شایع کی۔ آپ راجیہ سبھا کے ممبر بھی تھے۔ گاندھی جی نے آپ کو راشٹریہ شاعر کہا تھا۔ آپ کا کلام کئی ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ آپ کی عمر ۷۸ سال کی تھی۔ (روزنامہ دعوت دہلی)

خوشبو اور جوت

(ایک علامتی نظم)

روفی نعیم

ایک تھا پھول کہ جس کی خوشبو
دور اس کونے سے آکاش کے اس کونے گئی
اور پھیلی تو مہکنے لگیں دھرتی کی مدھر آشائیں
جاگ اٹھا اک نئے جیون کا سہانا سپنا
اس کی خوشبو بھی الگ اس کی رنگت بھی جدا
کاش! کوئی بھی نظر آتا مجھے اس جیسا
پھول کھلنے کو بہت کھلتے ہیں پھلواری میں

ایک تھا دیپ کہ جس کی جوتی
گھر کی سبھا سے بڑھی
اور یگ یگ کے اندھیرے سے الجھتی ہی رہی
جگمگا اٹھا اہنسا کا نگر
شانتی جس سے سجاتی رہی رنگین ڈگر
جوت میں اس سے ہو بڑھکر کوئی ایسا تو نہیں
دیپ جلنے کو بہت جلتے ہیں دیوالی میں۔

دیپ کی جوت کا جادو تو مگر باقی ہے،
پھول باقی نہیں خوشبو تو مگر باقی ہے

قطعات

نمی طہرانی

(۱) میری بانہوں میں کبھی ڈال کے بانہیں تونے
مجھ سے پیمانِ محبت بھی کیا تھا اک بار
اور پھر میں نے بصد نازِ مئے عشق کا جام
تیری مخمور نگاہوں سے پیا تھا اک بار

(۲) تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں جو گذری تھی
زندگی آج وہ ناکام ہوئی جاتی ہے
دل کی بے روح تڑپ، جسم کی مایوس پکار
موت ہاں موت کا پیغام ہوئی جاتی ہے

(۳) جب تصور میں بھی آتی نہ ہو تصویر تری
چاندنی رات کی رنگین فضا کچھ بھی نہیں
تو نہیں پاس تو ہیں چاند ستارے بھی اداس
دل کی دنیا میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

(۴) ہائے بیدرد زمانے کی یہ بیجا رسمیں
میری مجبور محبت کے لیے راس نہیں
اے بت زہرہ جبیں ظلم کی حد بھی ہے کوئی
ایک مدت سے بھلا تو بھی مرے پاس نہیں

اردو سوسائٹی حیدرآباد کی طرف سے مجلس مذاکرہ

"اردو سوسائٹی" کی جانب سے ۵ دسمبر کی شب کو ایک مذاکرہ "میرا حاصل مطالعہ" کے عنوان کے تحت جناب عبدالرحمٰن خاں عابد کی صدارت میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں مذکورہ عنوان پر جناب "سعید سعید" ایم۔ اے، جناب محمد عبدالعلیم صاحب قاری، جناب برق یوسفی اور رحمٰن جامی نے تقاریر کیں۔

قاری صاحب نے اپنی دلچسپ تقریر میں "انسانی زندگی" کو اپنا حاصل مطالعہ قرار دیا۔ "سعید سعید" ایم۔ اے نے کہا مرزا رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" ان کا حاصل مطالعہ ہے۔ برق یوسفی نے مخدوم محی الدین کی دو نظموں "چاند تاروں کا بن" اور "قید" کو شعری ادب میں اپنا حاصل مطالعہ کہا۔ رحمٰن جامی نے کہا ان کے نزدیک کوئی ایک ادب پارہ حاصل مطالعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ کئی ایک ادب پاروں کو انھوں نے اپنا حاصل مطالعہ قرار دیا۔ جن میں قابل ذکر اسعد گیلانی کا طنزیہ "انجمن ترقی یافتہ خواتین" ہے

یہ دلچسپ مذاکرہ رات کے ساڑھے نو بجے سے ڈیڑھ بجے تک جاری رہا۔ اس کے بعد حاضرین کے اصرار پر برق یوسفی رحمٰن جامی، جاوید حیدرآبادی اور شفیع اقبال نے اپنی نظمیں سنائیں۔

جلسہ کی ابتدائی کارروائی میں حضرت سرور ڈنڈا مرحوم کی تعزیتی قرارداد منظور کی گئی اور ایک منٹ کی خاموشی منائی گئی۔ برق یوسفی نے سرور ڈنڈا مرحوم کی زندگی ان کے کلام اور ان سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی اس کارروائی کے بعد ہی "میرا حاصل مطالعہ" کے تحت مذاکرہ شروع ہوا۔

آخر میں جلسہ کے کنوینر و نائب صدر اردو سوسائٹی جناب حسن یوسف زئی نے مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (معتمد اردو سوسائٹی)

محمد انصار اللہ نظر

"منظوم مظہر"

ادبیات قدیم کے واقفین ظہور اللہ خان نوآ کے نام سے بخوبی واقف ہیں لیکن ان کے شاگردوں کا ذکر عام طور پر تذکروں میں نہیں ملتا۔ خوش قسمتی سے جناب انوار حسین خاں نبیرۂ محمد اصغر حسین خاں صغیر گورکھپوری مرحوم سے راقم سطور کو "منظوم مظہر" کا ایک نسخہ دستیاب ہوا۔ سرورق کی عبارت اس طرح ہے۔

"...... کہ یہ مجموعہ خیر و برکت نظم نعت و مناقب اعلیٰ حضرتؐ خاتم رسالت و شہنشاہ ولایت تصنیف مولانا محمد شفاعت اللہ متخلص بہ شفاعت موسوم بہ اسم تاریخی۔

منظوم مظہر ۱۲۹۰ھ

"حسب فرمائش عالی جناب والا خطاب مولوی الہام اللہ صاحب خلف الصدق مصنف ممدوح رئیس بدایوں مطبع غالب الاخبار سیتاپور واقع دامان عنبریں زمیں بانزئیں محلہ تاسین گنج میں طبع ہوا۔"

کتاب میں شروع میں تین صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ ہے اس میں مولوی الہام اللہ لکھتے ہیں:-

"بعد حمد و نعت کے کج مج زبان ژولیدہ بیان محمد الہام اللہ ابن مولوی محمد شفاعت اللہ صدیقی مرحوم مغفور بدایونی خدمت میں نکتہ سنجان معنی کے عرض کرتا ہوں کہ بعد رحلت والد ماجد غفر اللہ لہٗ کے طبیعت احقر کی متوجہ انصرام امور دنیا رہی ...... الغرض تمام عمر والد ماجد مرحوم کی اسی طرح کی آراستگی نظم میں بسر ہوئی تلمذ آپ کو جناب ظہور اللہ متخلص نوا طوطی ہند سے تھا کہ جس کا شہرہ شیریں بیانی کا فرش سے عرش تک ہے اور بیعت آپ کو حضرت سید شاہ نصیر الدین حسین صاحب نیازی بریلوی ...... سے ہے تاریخ سترہ جمادی الثانی ۱۲۸۸ ہجری قدسی کو وفات پائی ...... چند قطعہ تاریخ وفات والد ماجد مرحوم کے .... تحریر کرتا ہوں" (ص۳)

اس کے بعد محمد الہام اللہ، حکیم حافظ محمد مجاہد الدین صاحب رئیس بدایوں، انصار حسین صاحب، محمد امداد حسین صاحب اور سید عبد الرحیم صاحب متخلص بہ شور ساکن بانس بریلی کے قطعات تاریخ تحریر ہیں۔ مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ شفاعت ظہور اللہ نوآ کے شاگرد تھے، مذہب کی طرف رجحان حاوی تھا چنانچہ تمام عمر نعتیں لکھیں، بدایوں کے رئیس تھے۔ اپنی حیات میں اپنا دیوان شایع نہ کر سکے ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نے دیوان مرتب کرکے شایع کیا دیوان کی کتابت چار مصرعی ہے مجموعی ضخامت اسّی صفحات کی ہے۔

شفاعت کی شاعری کا انداز عام شعرا سے الگ تھا غالباً یہ بھی ایک سبب ہوا کہ ان کو شہرت حاصل نہیں ہوئی، ان کے مراسم بھی شاید اپنے عہد کے معروف شعرا اور اساتذہ سے نہیں تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے صاحبزادے کسی مشہور شاعر سے قطعۂ تاریخ نہ لکھوا سکے البتہ دیوان کے آخر میں شیخ ریاض الدین امجد ریاض نے تقریظ لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم اس حلقہ میں ریاض کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

ریاض الدین امجد کا ذکر اس عہد کے تذکروں میں مختصراً ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے لوگ واقف ضرور تھے لیکن ان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی؛ مخدومی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے کئی سال ہوئے ان کی ایک تصنیف 'سیر ریاض' کو مرتب کرکے شایع کر دیا ہے اس کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس میں ریاض نے میرزا غالب سے اپنی ملاقات کا حال بھی لکھا ہے سیر ریاض کی زبان بہت ثقیل نہیں اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہ مصنف کا سفر نامہ ہے لیکن ریاض نے "منظوم مظہر" کی تقریظ میں کافی ادق الفاظ کا استعمال کیا ہے اور اپنی علمیت کا خاصا اظہار کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تقریظ لکھتے وقت اسے "منظوم مظہر" کے مندرجات اور اس کے مصنف کے نظریات کا بہرحال پاس کرنا پڑا ہے لیکن پھر بھی اس سے خود ریاض کے خیالات اور ان کے طرز استدلال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے یہ تقریظ سطور ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

"مسیح آسمان فصاحت کے اعلیٰ تقریظ چکیدہ کلک غرابت سلک شیخ ریاض الدین امجد متخلص بہ ریاض کلام ہوش افزا ہے، زبان آزادانہ سے ہے شیوا بیانی ملاحظہ ہو کیا مستانہ ہے گویا گیسوئے سلمائے معنی کی شانہ ہے؛

"بارد کن از روئے مثال کے ایک حباب سے

پیچ جو پوچھو تو ایک سبب ہے تخلیق بنی آدم کا' اور واسطہ ہے آفرینش ہجدہ (کذا) ہزار عالم کا اسی نظر سے کہ تزانہ کن جو قبل ایجاد جمیع کائنات واقع ہوا ہے وہ سخن ہے...... الست بربکم کہ بعد تمامی موجودات ظہور میں آیا تھا وہ بھی سخن ہی تھا اور جب ہر شے مقام فنا سے کامیاب ہو جائے گی تو صدائے سخن لمن الملک الیوم ایک اور ہی جھمکڑا دکھائے گی عرض کروں کہ حضرت حکیم علی الاطلاق نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے خز انہ کنت کنزاً مخفیاً کا ایک ایسا طلسم کھولا ہے نخلبند گلشن امکان بلبل وار ہر گھر پر کیا کیا بانگ بولا ہے، بابا بود و نابود کی کائنات ہے برگ و بار گل و خار رنگ و بو دل اور دل کی آواز زبان اور بیان غرضیکہ سب میں وہی بات ہے حضرت وجود کی دھوم ہے، بولتا سائیں کا ہے سب کو معلوم' داتا کا ارشاد ہے، مرشد مولانا کا حکم ہم کو یاد ہے کہ جب بندہ حالت ذوق و شوق میں آئے تو معبود کی صفات اور رسول مقبولؐ کی نعت زبان پر لائے جھوٹی (کذا) سچی نہ ہانکے زبان کو بے صرفہ سرائی سے بچائے، نعت رسولؐ باعث انفعال باری ہے پاک بے نیاز کے نام کی رٹ ذریعہ نجات ہے اور وسیلہ رستگاری ہے جس طرح کہ ہمارے جناب فضیلت انتساب آسمان زمین ذی کمالی شیرازہ اجزائے جرائد نازک خیالی، سالک مسالک طریقت' واقف دقایق حقیقت، حق آگاہ معرفت دستگاہ جناب مولوی محمد شفاعت اللہ طاب سراہ اپنے اکفاد اور اماثل میں بازی لے گئے ہیں بھلا فرمایئے کہ جو کوئی نعت جناب سرور کائنات میں نظم و نثر موزوں فرمائے گا تو اس کو سوائے مرتبہ حضرت حسّان اور عبدالملک رضؓ کے اور کیا ہاتھ آئے گا نعت رسولؐ جب کہے تو کہے نہیں تو بہتر ہے کہ چپکا رہے، مجاز سے بڑھ کر نہ چلے ظاہر کے پاس نہ پھٹکے اللہ اللہ کیا مجموعہ تصنیف فرمایا ہے کیسا صحیح و نقاد کے حسن خدا داد کو چمکایا ہے پھر قصیدہ، غزل، مخمس، مسدس تضمین، رباعی، مستزاد جو کچھ ہے کارنامہ روزگار ہیں...... کہ چمنستان الفاظ و معنی پر بہار رہے نہیں روح القدس کی روح بلبل وار گلہائے مضامین پر ہزار جان سے نثار ہے بندش مصادیع کا یہ حال ہے کہ تمام کلام صنایع لفظی اور بدایع معنوی سے مالا مال ہے حسن تعلیل احتجاج بدلیل ترصیع والتفات تضاد و طباق غرض ہر صنعت میں سب طرح کا مذاق مطالب وہ اچھند ہیں کہ آدمی تو کیا سبوحیان قدس کو پسند ہیں حسین میں شاہد معنی کا مرقع نظر آتا ہے دیدہ حقیقت اور چشم بصیرت کی نگاہ کو دیکھنے کا تماشا ہے نقیر کے کلام کا وہ لطف اٹھائیں گے جب اس مجموعہ کو بالاستعاب (کذا) معائنہ فرمائیں گے۔ معنی کی صورت لفظوں سے پیدا ہے آئینے صاف صاف تو منہ چوہ ہیں بدیہی کو برہان کیا ہے ضیا وحدت نور قدم مجوز نے لمعہ برق طور کا جلوہ دکھایا ہے ایسا کلام سننا سنت ہے کیوں کہ حضور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود سماعت فرمایا ہے بے برگ و نوا کی مجال نہ تھی جو شمہ اس کلام کی صفات سے بیان کرتا ہے لیکن پھر امتثال امر اور تقدیم ارشاد مخدومی مکرمی جناب مولوی محمد الہام اللہ صاحب کا جو خلف الصدق صاحب مجموعہ کے ہیں مسلم تھا اس لیے جادہ اطاعت سے کیوں کر گزرتا اور جو کچھ خیال میں آیا ارمغان خدمت ہے اگر مجموعہ کے ساتھ یہ چند سطور پریشان بھی طبع فرمائی جاویں گی تو یادگار رہیں گی اس سے کچھ غرض نہیں ہے کہ طبایع ناظرین اچھا جانے (کذا) یا برا کہیں گی اللہ بس باقی ہوس فقط (ص۹ تا ص۱۰)

ماسکو میں کرشن چندر کی کتاب کی نمائش

ماسکو ۳۰ر نومبر یہاں غیر ملکی ادب کی لائبریری میں کرشن چندر کی تحقیقات کی ایک نمائش کا افتتاح کیا گیا نمائش میں کرشن چندر کی لگ بھگ ۵۰ تصنیفات رکھی گئی ہیں۔ ان میں ہندوستانی عوام کی زندگی، قومی جنگ آزادی اور ہندوستان کا خطرہ حسن فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سوویت عوام کرشن چندر کو ان کے "شکست" "ایک عورت ہزار دیوانے"، "اور جب کھیت جاگے" وغیرہ جیسے ناولوں کے ذریعے بخوبی جانتے ہیں۔ (دستگم پٹنہ)

مراسلات

"ایسوپ،س فیبلس"

یکم نومبر ۱۹۶۲ء کے "ہماری زبان" کے صفحہ ۱۰ کالم ۲ میں اقبال کرشن صاحب نے عنوان بالا نام کتاب کا حال پوچھا ہے۔

انگریزی میں اس کا املا ہے: "Aesop's fables" دنیا کی کوئی شائستہ زبان نہیں ہے جس میں اس کا ترجمہ موجود نہ ہو۔ اردو میں "حکایات لقمان" کے نام سے ہے۔

Aesop یا لقمان یونانی تھے۔ قصہ گوئی اور ظرافت میں مشہور تھے۔ مگر اسی خصوصیت بات بڑی چُبھتی کہتے تھے۔ ایک تاریخی روایت یہ ہے کہ ایک (یونانی) مندر کے پجاریوں کے متعلق انھوں نے ان پجاریوں سے کوئی ایسی بات کہدی جو انھیں نہایت ناگوار ہوئی اور پجاریوں نے ان کو مار ڈالا۔

اسلامی روایت کے مطابق یہ حضرت داؤد پیغمبر علیہ السلام کے زمانے میں ایک یہودی کاشتکار کے غلام تھے۔ اور اپنے آقا کو اس کی بد افعالیوں پر متنبہ کیا کرتے رہتے تھے ایک بار آقا نے انھیں کھیت میں گیہوں بونے کا حکم دیا۔ وہ جو بو آئے۔ جب غلہ پیدا ہوا تو آقا نے ان سے جواب طلب کیا۔ انھوں نے جو بونے کا اقرار کیا۔ مگر یہ کہ انھیں امید تھی کہ پیدا گیہوں ہی ہوں گے۔ آقا نے ان کو ڈانٹا اور احمق بتایا۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ آپ بھی تو برے کام کرتے ہیں اور نیکی کی امید رکھا کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں سورتیں ایسے کاملوں کے نام سے ہیں جیسے یونس، ہود، یوسف، ابراہیم، مریم، محمد وہاں ایک لقمان کے نام سے بھی ہے۔ قرآن نے ان کو پیغمبر نہیں بتایا۔ مگر قرآن کے (پارہ ۲۱۔ اُتلُ ما اُوحیَ) اقوال نقل کیے ہیں وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے پیغمبروں کی زبانوں سے جاری ہوتے تھے۔

تاریخ میں یہ بھی ہے کہ کتاب حکایات لقمان میں جو حکایات ہیں ان میں ایسی بھی ہیں جو لقمان سے پہلے بھی منقول اور مشہور تھیں۔ لقمان نے اپنے ڈھب کا جان کر انھیں بھی اپنا لیا۔

(محمد مقتدی خاں شروانی)

غالب کا ایک شاگرد محمود حسین محمود

ہماری زبان مورخہ ۲۲۔ نومبر ۶۲ء کی اشاعت میں ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے غالب کے ایک شاگرد محمود حسین محمود کی دو تصانیف "حلوائے بے دود" اور "محمود نامہ اردو" کا تعارف کرایا ہے۔ آخر الذکر تصنیف سے متعلق ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ "بات کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ شاعر نے دیوان ان لوگوں کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا تھا جو شعر شاعری کے کوچے میں قدم رکھنا چاہتے ہیں اور پھر اپنی پیرانہ سالی ظاہر کرتے ہوئے کہ محمود شعر موزوں کر لیتے تھے لیکن ان کا شمار صف دوم کے شعرا میں بھی مشکل سے ہوگا دیوان کی ہر غزل کا ایک ایک شعر بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

ایک زمانے میں بیت بازی کا جب رواج تھا تو مکتبوں میں طلبہ کو دو فارسی رسالے "عطائی نامہ" اور "محمود نامہ" کے اشعار زبانی یاد کرائے جاتے تھے جنھیں وہ بیت بازی میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اول الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی غزلوں کے اشعار الف سے یا تک تمام حرفوں سے شروع ہو کر صرف ایک حرف یعنی لام پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک غزل جس کے تمام اشعار ہمزہ سے شروع ہوتے اور لام پر ختم ہوتے ہیں اس کا ایک شعر یہ ہے۔

ئیں ناظرہ ہیں بر صورت گل
ئگن زاب و تاب زلف سنبل

محمود نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ پہلی غزل کے تمام اشعار الف سے شروع ہوتے اور الف پر ہی ختم ہوتے ہیں چنانچہ اس کا پہلا شعر مشہور ہے۔

اے داغ بردل از غم خال تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

اسی طرح دوسری غزل کے اشعار بے سے شروع ہوتے اور "بے" پر ختم ہوتے ہیں علیٰ ہذا القیاس محمود نامہ اردو اسی محمود نامہ فارسی کے طرز پر لکھا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے ہر غزل سے جو ایک ایک شعر پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے۔ اس بات کے پیش نظر محمود نامہ اردو کی اہمیت اور خوبی واضح ہو جاتی ہے۔ کسی تحقیقی قیاس آرائی اور اشعار کی خوبی کے متعلق رائے زنی کی گنجائش نہیں رہتی۔

(سید فخر الحسن حیدرآباد دکن)

سب غلط!

آج کل ان صفحات پر Robust Language کے اردو ترجمے کی مقابلہ بازی کا بازار گرم ہے۔ مسرور صاحب کے ترجمے "نگرّی زبان" کو چھوڑ کر باقی تمام کے تمام یکسر غلط ہیں۔ یہ تمام ترجمے انگریزی لفظ کا موٹا سا مفہوم تو سمجھا دیتے ہیں مگر صحیح معنوں میں "ترجمہ" کہلانے کے مستحق نہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سترودہ صاحب کا ترجمہ میں صحیح مان رہا ہوں؛ نہیں یہ بھی غلط ہے۔ وہ یوں کہ Robust کا قریب ترین مساوی لفظ "تگڑا" نہیں ہو سکتا۔ بے شک Robust کے معنی "تگڑا" ہی ہیں لیکن کیا پوری اردو زبان میں اس مفہوم کا یہی ایک لفظ ہے؟

لفظ Robust پر غور کیجئے۔ یہ لاطینی لفظ Robustum سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں Oaken پھر اردو صوتیات کے اعتبار سے "تگڑا" کا لفظ Robust کی طرح نرم اور ملایم نہیں ہے؛ اور نہ ہی یہ لفظ پورے طور پر Robust کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ Robust کا قریب ترین مساوی لفظ کیا ہو۔ تو میں اس کے لیے "گٹھیلا" کا لفظ پیش کروں گا۔ لیکن اس سے بھی میری پوری تشفی نہیں ہوتی ہے کیونکہ Robust دو رکنی (Dissyllabic) لفظ ہے جب کہ "گٹھیلا" سہ رکنی لفظ (Trisyllabic) ہے "تگڑا" میں جو بات کھٹکتی ہے وہ ہے اس کی "بدصوتیت"۔ فیصلہ کسی "بڑے" پر چھوڑتا ہوں۔

(اقبال کرشن)

انکشاف

"ہماری زبان" بابت یکم دسمبر صفحہ ۱۰ پر "جواب استفسار" کے عنوان سے ؎

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

کی بابت لکھا گیا ہے کہ یہ شعر عندلیب شادانی صاحب کا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے شعر مندرجہ بالا ڈاکٹر شادانی صاحب کا نہیں بلکہ جناب اختر انصاری صاحب کا ہے (جو بقول فراق صاحب "اکبرآبادی نہیں ہیں")

میر اور میرزا کی بحث کے سلسلہ میں غالباً یہ اطلاع بھی دلچسپ رہے گی۔ کہ پنجاب میں دو الفاظ یعنی ملک اور میاں اکثر ہندو، مسلم اور سکھ افرادِ خاندان کے ساتھ مستعمل رہا۔

(سورج تنویر)

استفسار

(۱)

یہ شعر کس کا ہے۔

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

(خرد غوث پوری)

(۲)

اگر کسی صاحب کے علم میں ہو تو ازراہ کرم بتائیں کہ یہ مشہور شعر کس کا ہے؟

اگر تجھے نہ ہے قسمت لہٰذا تجھے تو شکایت کیا
سر تسلیم خم ہے، جو مزاج یار میں آئے

(نثار احمد فاروقی)

مشرقی برلن میں اردو کی مقبولیت

پروفیسر ڈومین کا اظہار خیال

لکھنؤ۔ ۶۔ دسمبر ۱۹۶۴ء کارل مارکس یونی ورسٹی لپزی میں انڈین ہسٹری کی پروفیسر مسز ڈومین نے جو یہاں ماڈرن انڈین ہسٹری پر تحقیق کے سلسلے میں آئی ہیں شاعروں اور ادیبوں کے ایک جلسے میں اپنی تقریر کے دوران ساحر لکھنوی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مشرقی جرمنی کی یونی ورسٹی میں اردو کا شعبہ بھی قائم ہے اور وہاں اردو شعر و ادب سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ پروفیسر مسز ڈومین نے برلن کی ادبی سماجی اور ثقافتی زندگی پر کافی تفصیلی تقریر کی۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی معاشی حالت کے بارے میں مسٹر ساغر مہدی کے ایک استفسار پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ برلن میں ادیبوں اور شاعروں کی معاشی زندگی بہت اچھی ہے اور بالکل نئے لکھنے والوں کو بھی ایک کہانی یا نظم پر آٹھ نو سو روپیہ کے مساوی معاوضہ مل جاتا ہے۔

بدرالزماں صاحب ایڈوکیٹ کے مکان واقع نیا گاؤں میں یہ جلسہ مسٹر عارف نقوی کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ جو مشرقی برلن میں اسٹیج ڈرامہ پر اپنی تحقیق مکمل کر رہے ہیں۔ مسز ڈومین کو مقامی شاعروں اور ادیبوں سے متعارف کرانے کے بعد عارف نقوی نے برلن کے آرٹ اور کلچر پر تقریر کے ساتھ ساتھ مختلف سلائڈز بھی دکھائیں۔

اس جلسے میں جو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کے پروفیسر ڈاکٹر تو وبا کی صدارت میں ہوا مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

مس تسنیمہ نسرین، ساحر لکھنوی۔ آفتاب اختر، ساغر مہدی، محمد الحسن رضوی ایم۔ اے۔ فاطمی، ہزار لکھنوی۔ اقبال ندیم، شاداں بارہ بنکوی، عبد الحلیم اور شاہِ عالم۔

(نامہ نگار)

پبلشرز متوجہ ہوں

جنوبی ہند میں بنگلور تقریباً ایک صدی سے اردو شعر و ادب کا مرکز رہا ہے۔ اس سرزمین میں ایسے ایسے قابل قدر علما و فضلا اور باکمال شعرا و ادبا گزرے ہیں جن کے قومی کارنامے، علمی تحریکات اور ادبی خدمات کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

میرے والد مرحوم امام الفن حضرت نفیسؔ اسی مکتب کی باقیات میں تھے اور آپ کی ہستی اہل بنگلور کے لیے مغتنمات کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ نہ صرف ایک بہترین غزل گو شاعر تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب، ایک ماہر فن محقق اور زباں داں بھی تھے آپ فصاحت جنگ جلیلؔ مانکپوری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اس کے علاوہ آپ نے زبان و ادب، شعر و عروض کے مختلف پیچیدہ مسائل اور اکتساب علم و فن کے لیے دیگر مشاہیر ادب سے معاصرانہ تعلقات و مراسم پیدا کیے اور مسلسل تحقیق و تدقیق کے بعد زبان و عروض کے چند ایسے شہ پارے تیار کیے ہیں جو ادب عالیہ کہلانے کے لائق ہیں۔ یوں تو آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں لیکن دو کتابیں اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

"ادبی استفسارات" جس میں معاصرین سے مختلف ادبی و فنی استفسارات کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ "مشاہیر کے گرامی نامے" جن کی تعداد تقریباً سو ہے۔

اگر کوئی پبلشر ان کی اشاعت کے لیے آمادہ ہو جائے تو یہ گراں مایہ قیمتی ادبی ذخیرہ محفوظ ہو جائے گا۔ اور اس کی افادیت بڑھ جائے گی۔

میں مناسب حق معاوضہ پر اس کے جملہ حقوق خواہشمند پبلشرز کو دینے کے لیے تیار ہوں۔ ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کریں۔

رحیم مینائی ۔ ۱۴۷ اولڈ کرچ پالیہ بی "ڈسٹرکٹ بنگلور ۲

سرور ڈنڈا کے کلام کو شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے

حیدرآباد۔ ۲۹ نومبر۔ ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کے زیر اہتمام آج شام اردو ہال میں منعقدہ ایک جلسہ میں غلام سرور خاں ڈنڈا مرحوم کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ ڈنڈا کی شاعری سماجی ناانصافیوں کے خلاف ایک بھرپور طنز ہے۔ آج ان کی بھرپور شخصیت اور ان کی سحر کن آواز ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ جو پیام دیا ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ راجے جانکی پرشاد نے اردو مجلس کی جانب سے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈنڈا نے روزمرہ زندگی کے مسائل کو طنز و مزاح کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو دوستوں کو چاہیے کہ مرحوم کو صحیح خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کے کلام کی اشاعت میں اپنا حصہ ادا کریں۔ مسٹر مغنی تبسم نے اپنے مضمون میں کہا کہ سرور ڈنڈا اپنے فن میں منفرد تھے وہ باشعور فن کار تھے۔ انھوں نے ساہتیہ اکیڈمی سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ ڈنڈا کا کلام اہتمام کے ساتھ شائع کرے گی۔ مسز صفیہ اریب نے اپنے مضمون میں کہا کہ سرور ڈنڈا نے ظلم و ناانصافی کے خلاف اپنی شاعری میں آواز بلند کی۔ سلیمان خطیب نے ڈنڈا کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب میں اکیلے پن اور تنہائی کے عجیب احساس میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ڈنڈا اردو نہ جاننے والوں میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ ڈنڈا کی مقبولیت صرف اردو بولنے والوں کی حد تک محدود نہیں تھی۔ جب گنٹور میں ان کے انتقال کی خبر پہنچی تو غریب محنت کش اور کھیت مزدور تک یہ کہتے سنے گئے کہ "سنجیوا ریڈی ماما" والا شاعر مر گیا۔ یہ صرف ڈنڈا کی مقبولیت ہی نہیں ہے بلکہ اس زبان کی مقبولیت ہے جس میں وہ شعر کہتا تھا۔ پروفیسر سید محمد نے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے خراج عقیدت پیش کیا۔ مسٹر مخدوم محی الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سرور ڈنڈا کی شخصیت پر تلنگانہ تحریک، ٹریڈ یونین تحریکوں اور ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر تھا۔ انھوں نے عوام کی مخالف طاقتوں اور ظلم و ستم کے خلاف کھلم کھلا آواز اٹھائی۔ بین الاقوامی امن سے لے کر ہندوستان کے روزگار کے مسائل تک ان کے پیش نظر ہوتے۔ ان کی نظم "سنجیوا ریڈی ماما" آندھرا کے نئے قائد کی خدمت میں عوامی مطالبات کا ایک چارٹر تھی۔ مخدوم صاحب نے کہا کہ ڈنڈا دوسری زبانوں کے مترنم بحروں کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے تھے ان کا نفس مضمون شستہ اردو کے شاعروں کے مقابلہ میں اعلیٰ و ارفع ہوتا تھا۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

"گوشہ میں قفس کے"

اس نام سے جناب غلام سرور ایڈیٹر روزنامہ سنگم نے اپنے ایام اسیری کا روزنامچہ مرتب کیا ہے۔ یہ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے محصول ڈاک کے علاوہ اس کے عام اڈیشن کی قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے اور خاص اڈیشن کی قیمت دو روپے ہے۔ یہ کتاب ملک بانو معرفت اصغر النسا غلام سرور سنگم پبلیکیشنز صدر بازار دانا پور کینٹ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

"ہماری زبان" سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں تاکہ مراسلت میں سہولت ہو۔

جگر کی غزلیہ شاعری

اس عنوان سے اشفاق علی خاں نے ایک کتاب میں جگر کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ کتاب کا ابتدائیہ فوری طور پر قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے "تنقید کم سے کم تین سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے، کیا ہے؟ کیسی ہے؟ کیا ہونا چاہیے؟ (صد) اسی طرح اصلی کتاب کے شروع میں "اردو غزل کی عام تنقید" کے عنوان کے تحت ذیل کے نکتے بہت گہرے اور دور رس ہیں: "فارسی غزل کا یہ بنیادی ضابطہ بھی اردو غزل کا دستور العمل ہے کہ شعر کے موضوع و مضمون کی حیثیت محض رسمی ہے، وہ شاعر کے عقیدہ کی پیداوار نہیں ہے۔ ...... مروجہ مضامین کی گرفت متغزلین کے دلوں پر اتنی سخت تھی کہ وہ مقدس حقیقتیں جن کا تصور بھی شراب اور امرد پرستی کے مفہوم سے لرزتا تھا جب شعر کے میدان میں اترتی تھیں تو ان مضامین سے شغل کرنا بھی فرضِ عین سمجھتی تھیں" (ص۱۴ و ۱۵)۔ اس طرح کے بیش قیمت نکتے پوری کتاب میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے ہیں، مگر افسوس کہ مصنف ان نکتوں کا بھرپور تجزیہ اور پوری تشریح و تفصیل نہیں کرتے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اگر ان نکات کا حق ادا کرنا مقصود ہے تو اردو تنقید کا یہ ایک ایسا اچھوتا اور اہم موضوع ہے کہ خاص اس پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

بہرحال یہ زیرِ تبصرہ کتاب کی ایک خصوصیت ہے اور اس کے اعتبار سے اشفاق علی خاں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جدید تنقید کا غلط اثر نہ قبول کر کے بنیادی ادبی مسائل پر خود سوچا اور کم از کم حقیقت کا سراپا گئے۔ لیکن اپنے ان مقدمات کی روشنی میں مصنف نے جگر کے فن پر جو تبصرے کیے ہیں ان میں بیشتر مبالغے سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات مغالطے پیدا ہو گئے ہیں۔ جگر کے متعلق مصنف کی حسبِ ذیل رائیں محلِ نظر ہیں۔ "قدرتِ زبان کا فقدان اور تخیل کی پستی جگر کے اسالیبِ بیان کے دم کے ساتھ ہیں" (ص۱۴۲) "عادتاً جگر میں اسالیب اور الفاظ کے حسنِ انتخاب کا سلیقہ یا ملکہ نہیں ہے" (ص۱۴۳) صرف ایک جگہ جگر کے ایک ہنر کا اعتراف بھی کیا ہے تو عیب چینی ہی کے انداز میں "جگر کے اندازِ بیان کی ایک نمایاں خصوصیت جوش و سرمستی ہے اور یہی ان کے کلام کا سب سے بڑا حسن ہے۔ جگر کے کلام کو اگر کوئی چیز زیادہ دنوں تک زندہ رکھ سکتی ہے تو وہ ان کی یہی خصوصیت ہے اگر اس خصوصیت کو جگر سے الگ کر لیا جائے تو جگر کے کلام میں کوئی جان نہیں رہتی ہے۔ لیکن ان کی یہ خصوصیت بھی ان کی ذاتی چیز نہیں ہے اسے داغ، اصغر اور حسرت، ان تینوں کا مشترکہ پرتو سمجھنا چاہیے" (ص۱۴۶) پوری کتاب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ تصنیف کا مقصد جگر کی تنقید سے زیادہ تنقیص ہے۔ چنانچہ چن چن کر جگر کے تمام کمزور پہلوؤں کو بڑی کاوش کے ساتھ اکٹھا کر دیا گیا ہے، یہاں تک کہ خوبیوں کو بھی خامیوں کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ کسی ادبی یا علمی مطالعے کا یہ انداز صحیح نہیں۔ ایک تو تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے اور دکھانے چاہئیں، دوسرے عیب و ہنر کے متعلق آخری فیصلہ ہنر کی پوری تفتیش کے بعد کرنا چاہیے۔ ناقد کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اپنے موضوع کے محاسن کی تلاش کرے، اس کے بعد معائب کو دیکھے، پھر دونوں کا موازنہ کر کے میزان نکالے کہ کون پہلو غالب ہے، اور بحیثیت مجموعی حسن و قبح کا حکم غالب پہلو کی بنا پر لگائے۔ اشفاق علی خاں نے اس فرضِ منصبی کی ادائگی میں سخت کوتاہی کی ہے۔

اس سلسلے میں دو باتیں اور ایسی ہیں جن کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اول یہ کہ مصنف شاعروں کی تقسیم اس طرح دو فرقوں میں کرتے ہیں "سہولت بحث کے لیے پہلی قسم کے متغزلین کو صرف اندازِ بیان کا شاعر اور دوسری قسم کے متغزلین کو صرف مضمون کا شاعر کہا جائے گا" (ص۱۱)۔ شاعروں کی یہ درجہ بندی بالکل میکانکی اور نہایت مصنوعی ہے۔ کوئی بھی فن کار ہو اس کی تخلیقات ہمیشہ مواد اور ہیئت دونوں کا ناقابلِ تقسیم مرکب ہوتی ہیں چنانچہ اس فن کار کے متعلق جو بھی تنقید کی جائے گی اس کے لیے لازمی ہوگا کہ مواد اور ہیئت، مضمون اور اندازِ بیان، دونوں کو یکساں طور پر پرکھے۔ یہ تو ایک ~~عام اصولی~~ نقد ہوا، خاص ~~طور~~ پر یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ جگر صرف اندازِ بیان کے شاعر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جگر کا اندازِ بیان بڑا تیکھا اور پیارا ہے بلکہ ان کے کلام کی پہلی اپیل شاید طرزِ ادا ہی کے ذریعہ ہوتی ہے مگر اس کی بنا پر یہ فرض کر لینا کہ جگر بس اندازِ بیان تک ہیں، نہایت سطحی اور طفلانہ بات ہے۔ جگر کی نظموں (مثلاً "ساقی سے"، "یاد کا عالم"، "قحطِ بنگال" وغیرہ) کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ مگر جگر کی بہت ساری غزلیں بھی ایسی ہیں جو کیفیتِ معنی سے معمور ہیں، مثلاً وہ غزل جس کا ایک شعر ہے۔

اٹھا جو پردے سے پردۂ شبِ حسن کے مرکز پہ آ گئے سب
تمام جلوے جو منتشر تھے طلوعِ حسنِ بشر سے پہلے

اسی طرح وہ غزل جس کا ایک شعر ہے۔

سبزہ و گل، موج و دریا، انجم و خورشید و ماہ　　اک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے

جگر کا مجموعۂ کلام "آتش گل" اس قسم کی غزلوں سے بھرا ہوا ہے یہاں تک کہ وہ غزلیں بھی جن کو مصنف بقیت انداز بیان کا کرشمہ کہیں گے اس قسم کے شعروں سے خالی نہیں۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن — لیکن اپنا اپنا دامن

اور جہل خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

دوسری بات یہ کہ کتاب کا نصف سے زاید حصہ عروضی و لسانی بحثوں پر صرف کیا گیا ہے اور بہت دور دور کی کوڑیاں لائی گئی ہیں۔ یہ جگر کے دشمن ازلی نیاز فتح پوری کی وہ تکنیک ہے جس کی ادبی دائرے میں کوئی قدر و قیمت نہیں اور جس کو اردو دنیا نے رد کر دیا ہے۔

بہرحال "جگر کی غزلیہ شاعری" اس قابل ہے کہ جگر سے دلچسپی رکھنے والے ایک نظر اس کو بھی دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ دلچسپی کا ایک پہلو مصنف کی اردو فن تنقید کے بارے میں فکر انگیز بحثیں ہیں۔

ایم۔ عرفان کو اقبال لائبریری کی طرف سے استقبالیہ

اتوار کو صبح ۹ بجے اراکین مقامی اقبال لائبریری کی طرف سے ایم عرفان صاحب کو "شعلۂ حیات" کے تاریخی نمبر کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اراکین کی طرف سے ترجمانی کرتے ہوئے لائبریرین نے کہا کہ "شعلۂ حیات" کا خاص نمبر جس میں بھوپال کی تاریخ لکھی گئی ہے اگر اس کو مکمل نہیں کہا جا سکتا تو بہرحال یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس تاریخی نمبر کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس میں عرفان صاحب نے جتنی محنت اور وقت صرف کیا ہے اور جس طرح اس کے ذریعہ سے انھوں نے بھوپال کے تاریخی واقعات و حقائق کو مجتمع کیا اس کے لیے ہم ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور آئندہ اس سلسلہ میں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔

عرفان صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں اراکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کے خلوص سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں میں نے اس نمبر کی اشاعت کے سلسلہ میں بہت جانفشانی سے کام کیا لیکن افسوس کہ جیسا تعاون ملنا چاہیے نہ مل سکا جس کی وجہ سے اس میں چند اہم چیزیں بھی شامل ہونے سے رہ گئیں، جو حسب سہولت کسی آئندہ اشاعت میں شامل کر دی جائیں گی عرفان صاحب نے اجمالاً بھوپال کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور کہا کہ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ بھوپال ادبی اعتبار سے کچھ نہیں ہے سراسر غلط ہے۔ اس لیے کہ ہمارا مطبوعہ علمی سرمایہ اس کا ضامن ہے کہ بھوپال جیسی چھوٹی جگہ میں اردو ادب کا مقام بہت بلند رہا ہے۔ یہ نشست تقریباً ایک گھنٹہ چالیس منٹ جاری رہنے کے بعد بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ آخر میں عرفان صاحب کو ہار پہنائے گئے اور پر تکلف پارٹی دی گئی۔ (روزنامہ ندیم)

عالم فتحپوری، آفتاب لکھنوی اور پریم گوپتا بزم فنکار میں

۱۱ دسمبر، بھوپال۔ بزم فنکار کی پندرہ روزہ نشست لبرٹی ہاؤس میں بوقت ۸ بجے شب زیر صدارت [illegible] منعقد ہوئی اس جلسہ میں پریم چند گپتا سوز، عالم فتحپوری اور آفتاب لکھنوی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ مقصود عمرانی، وحید پرواز اور وفا صدیقی نے غزلیں اور محمد یوسف نے دو مختصر کہانیاں تنقید کے لیے پیش کیں۔

وحید پرواز کی غزل کافی پسند کی گئی۔ دو شعر درج ہیں۔

مجھے نہ چھیڑو حسین یادو تم اپنی بستی میں لوٹ جاؤ
میں ان کے وعدوں کی خاک اوڑھے غموں کی بانہوں میں سو رہا ہوں

تمھارے جلووں کی بادشاہت، تمھارے جلووں کی حکمرانی
تمھیں مبارک یہ زندگانی، میں آج دنیا کو چھوڑ رہا ہوں

وفا صدیقی نے جو غزل پیش کی اس کے کچھ اشعار پر چھوٹے چھوٹے مشوروں کے علاوہ ایک مصرع بدلنے کا مشورہ دیا جسے انھوں نے منظور کر لیا۔ دو شعر درج ہیں۔

ٹوٹے گی نہ ظلمات کی دیوار کہاں تک
اٹھے گی نہ وہ چشم سحر بار کہاں تک

اس طرح تو سر معرکۂ دار نہ ہوگا
چھپاؤ گے وفا کو چہ دلدار کہاں تک

محمد یوسف کی دو مختصر کہانیاں پسند کی گئیں لیکن [illegible] کے بارے میں بحث ہوئی تو محمد یوسف نے انھیں کہانی کے بجائے خیال بتلایا۔ شرکاء نے انھیں ادب لطیف سے قریب کہا۔

مقصود عمرانی کی غزل کافی پسند کی گئی البتہ مطلع میں "شب کے کجلانے" کے استعمال پر اعتراضات کیے گئے۔ دو اشعار سنیے۔

بجھے بجھے سے دیے جیسے ستارے سر فلک — افشاں چھڑائی جاتی ہے یادوں کے نام
وہ خامشی کہ حرف تمنا کا دم گھٹے — سناٹا پڑ گیا تری بستی میں شام سے

نشست کے اختتام سے پہلے مہمان شعراء نے بھی کلام پیش فرمایا۔ (فضل تابش)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نور الحسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند سے شائع کیا